

حج کا مقصد

ہیروزین

آپ نے یہ الفاظ بہ محراب و منبر اور ہر سطح اور پلیٹ فارم سے سنے ہوں گے، اور بار بار سنے ہوں گے کہ اسلام نوری انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بار بار سنے ہوں گے، لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سنا ہوگا کہ نوری انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کر سکتی ہو۔۔۔ اس کے لئے اسے غیروں کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہو۔۔۔ وہ نوری انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سنتی ہیں تو استہزاء کی منہسی منہسی کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو حل کرو، اس کے بعد نوری انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا!

یہ درحقیقت مذہب کی ٹیکنیک ہے کہ وہ نہایت مقدس اور خوش آئند الفاظ کے ذریعے اپنے معتقدین کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے اور ان کے ذہن کو کبھی اس طرف نہیں آنے دیتا کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم معلوم کریں یا سوچیں کہ ہم جو دعویٰ کرتے ہیں اس کا عمل ثبوت کیا ہے۔ مذہب کا سارا دار و مدار بلا مفہوم الفاظ کے دہرائے چلے جانے اور بلا نتیجہ رسومات ادا کئے جانے پر ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام بھی الدین نہیں رہا، مذہب بن چکا ہے، اس لئے ہم بھی نہ الفاظ کے مفہوم کی طرف آتے ہیں اور نہ ہی اپنے دعاوی کے عمل ثبوت کی طرف۔

اس وقت تمام اقوام عالم گونا گوں مشکلات کا شکار ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک پر اہم کا حل قرآن مجید کی روشنی میں پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری یہ کوشش قرآنی الفاظ، اصطلاحات، اور تصورات و نظریات کا متعین مفہوم پیش کرنے تک محدود ہے۔ عملی نتائج سے اس کے دعاوی کا ثبوت ہم پہنچانا میرے بس کی بات نہیں کیونکہ وہ ثبوت تو قرآنی نظام کے قیام ہی سے ہم پہنچ سکتا ہے، اور نظام کا قیام کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہوتی، یہ امت کی اجتماعی کوششوں ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ بائیس سال میں گزشتہ قریب تیس سال سے اپنی ان کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ قوم کے ارباب بصیرت اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اس وقت ہمیں جو کچھ اسلام کے نام سے ہورہا ہے وہ مذہب ہے، دین نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے شاید آنے والی نسلیں استفادہ کر کے دین کا نظام قائم

کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اقوام عالم متعدد گونا گوں مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں۔۔۔۔۔ میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مسئلہ کو لوں گا جو درحقیقت مشکل ترین مسئلہ ہے اور فوج انسان کے موجودہ مصائب اور ممکنہ تباہی کا موجب ہے۔ اور وہ ہے نیٹو نلزم۔ میں اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ خود اقوام مغرب اس کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر مضطرب و بے قرار۔ لیکن انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس نشست میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنی کریم نے اس کا نظری حل کیا بتایا اور علی پر و گرام کیا تجویز کیا۔

(3)

نوع انسان کی تمدنی یا معاشرتی زندگی کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی، مغرب کے علماء علم الانسان نے اس باب میں خاصی تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآن کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیش نظر منزل تک پہنچنے کا آغاز سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا كَانَتِ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَأَخْتَلَفُوا ۚ..... (سجۃ)۔ "نوع انسان شروع میں ایک امت، ایک جماعت، ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے۔" ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور اس کے بعد قبیلوں میں بٹ گئے اور اس تفریق کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ طبع و سیر سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اُس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلک زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اس کا نام نیشلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوع انسان کو محیط ہے۔ اس سے نہ کرۂ ارض، نہ کرۂ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان۔

نیشلزم نوع انسانی کا فرد کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کب اور کچھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوع انسان کی یہی کیفیت ہے، اس میں نہ اقوام مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوام مشرق کی

متنبر۔ اقبال کے الفاظ میں:۔

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں ستیہار
قرآن کریم نے بتایا کہ نوری انسان اپنے مافقوں کی لالہ ہوئی جس مصیبت کا شکار ہو گئی تھی اس سے نجات دینے
کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورہ بقرہ میں ہے:-

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفْنَا لِيَكُونَ لِلنَّاسِ لِسُنُّاتٌ مِثْلُ النِّعَمِ ثُمَّ نَحْنُ مُعْدِلُونَ

اِخْتَلَفُوا فِيهِ ط..... ۵ (۲۱۳)

چونکہ نوع انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بعثت انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانین خداوندی کا ضابطہ لاتے تاکہ وہ اُس کی رو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروان انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھالنا۔ اس کے لئے وحی نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ، رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک امت کے افراد ہیں۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری امت کے افراد۔ اسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیاسی اصطلاح میں اسے ”دوقومی نظریہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا، لیکن اس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیمؑ کے ہامضوں وجود پذیر ہوئی۔ انہوں نے ماں باپ، برادری، قوم، اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی امت کی تشکیل کی اور اُس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لئے ایک محسوس مرکز کا وجود لایمکن ہوتا ہے۔ انہوں نے وحی خداوندی کی راہنمائی میں مکہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعمیر کیا، جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:-

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝ (۲۴۹)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن، رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کے لئے وجود میں لایا گیا تھا، مکہ کی مبارک وادی میں (خانہ کعبہ) تھا۔ یہ کاروان انسانیت کی منزل مقصود کے لئے نشان راہ تھا۔

اسے تمام انسانی نسبتوں سے بلند بالا قرار دینے کے لئے، اللہ تعالیٰ نے ”اپنا گھر“ (بیتہ) (۲۵۰) کہہ کر بپارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر ”اپنی“ کہہ کر بپارا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، نہ اس پر کسی کا قبضہ ہو سکتا ہے۔ (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض اللہ (اللہ کی زمین)۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو الناس (نوع انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآن کریم میں آئی ہیں ان میں ہر جگہ ”الناس“ ہی کہا گیا ہے۔ یہ سلسلے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وحی خداوندی کا مقصود و مطلوب

لنّاس کا مقصد

نوع انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لئے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے "لنّاس" ہی کہا جانا چاہیے تھا۔

اور یہی قرآن نے کیا۔

اب یہ دیکھئے کہ نوع انسان کی اس مرکزیت سے مقصود کیا تھا۔ فرمایا:-

جَعَلَ اللَّهُ الْكَعْبَةَ الْغُبِّيَّةَ الْمَبِيتَ الْحَوَامِ قِيَامًا لِلنَّاسِ ۵ (۹۶)

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تاکہ اس مرکزیت سے نوع انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو سکے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسانیت، قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سپر پائیزز ————— یعنی بڑی مہیب قوتوں کی مالک قومیں۔ اور دوسری، کمزور اور غیر نشوونما یافتہ (UNDERDEVELOPED) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سپہ سالار کا محتاج ہونا ظاہر ہے۔ یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن طرہ تماشا یہ ہے کہ خود سپر پاورز اپنی قوت کے لئے ان کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں، وہ اتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد یا امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں، لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دین کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکیں۔

لیکن اگر قومینوں کے مٹ جانے کے بعد نوع انسان اُمت واحدہ بن جائے تو اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے کسی خارجی سپہ سالار سے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اولین ثمرہ۔ یعنی قیام لنّاس۔ نوع انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

اب آگے بڑھیے۔ اس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی، سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی ہوئی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے تو افراد، خوف دہرا اس کے جس جہنم میں زندگی گزارتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع و عریض کرہ ارض پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا مامن ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامن سمجھ لے۔ کعبے کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا:-

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْسًا ۵ (۱۲۵)

اور ہم نے کعبہ کو نوع انسان کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا

خوف و خطر نہ ہو۔

دوسری جگہ ہے: وَمَنْ ذَلَّلْنَاهُ لَا تُغْنِ عَنْهُ كَثْرَتُهُمْ وَلَا يُمْسُوا ۵ (۱۲۶) جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے، اسے امن کی ضمانت مل جائے گی۔

بات واضح ہے، دنیا میں خوف و خطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے۔ جب ان کی جگہ ایک ایسی اُمت وجود میں آجائے گی جس میں یہ تفریق نہیں ہوگی تو وہ مجاہدوں کی طرح امن و سلامتی سے رہے گی۔ اسے نہ کہ داخلی خطرہ کا اندیشہ ہوگا، نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچئے کہ اس سے یہ کُہ اڑے جو اس وقت جہنم نازین رہا ہے، کیسا امن و سلامتی کی جنت بن جائے گا!

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ، دوسرے ملک میں قدم تک نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ (VISA) حاصل نہ کر لے۔ کعبہ کے متعلق کہا۔

جَعَلْنَاهُ مِلَّةً تَسُوَّاءً مِّنَ الْأَعْيَانِ فِيهِ ذِكْرُ الْمَوَدَّةِ..... (۲۳)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے، اس گھر کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں، کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں، کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی

ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (رب الناس) کا گھر ہے، اس لئے اس کے دروازے ہر انسان کے لئے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آجائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے قبیلہ کعبہ کے بعد دعایہ مانگی تھی کہ اس خطہٴ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا، جو لوگوں کے لئے وجہ کشمکش نہ ہو سکے۔ بارالہ! تو ایسا کر دے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور وہ فوج در فوج ادھر آنے لگ جائیں۔ (۲۴)

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نذریع انسان کے لئے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام یا گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ گھر قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے یہ طے کیا ہے تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے۔ اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح "کعبہ" سے مراد وہ نظامِ خداوندی، وہ قرآنی مملکت ہے، جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔

(۵)

حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آپ، صدیوں پہلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو اکٹھا کر، چھٹی صدی عیسوی میں آجائے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لئے سب سے پہلے ایک اُمت تشکیل کی گئی جو رنگ نسل، خون، وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمت کے وجود کا مقصد کیا تھا، اسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا جب کہا کہ کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ..... (۲۵) تم وہ بہترین اُمت ہو جسے نذریع انسان کے لئے پیدا

کیا گیا ہے۔ غور کیجئے! جن طرح کعبہ کا مقصد نوع انسان کی فلاح و بہبود تھا اُسی طرح اس اُمت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (الناس) کی خیر طلبی تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس اُمت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی نوع سے اس اُمت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ

وَكُنْ اِيْلَكَ جَعَلْنَاكُمْ اُمَّةً وَسَطًا لِتَكُوْنُوْا شٰهَدًا عَلٰى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ مُّشٰهِدًا ط..... (۲۱)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمت بنایا جو تمام نوع انسان سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی، نہ کسی سے یونہی کھینچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تم نوع انسان پر نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت کی طرف نہ اٹھنے پائے۔ اور تم پر تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسول) نگاہ رکھے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کرو۔

یہاں پھر شہد آئے عَلَى النَّاسِ کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوع انسان پر نگران۔ ان خصوصیات کی حامل اُمت کو "ملتِ ابراہیمی" (۲۲) کی پروکار کہہ کر پکارا گیا، یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمت۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا: اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا مَّابَدِ (۲۳) "نوع انسان کی امامت LEADERSHIP تمہارے حق میں آئے گی" اور اسی بنا پر اس اُمت سے کہا: وَ اَتَّخِذْ دَاوُودَ وَ اٰیْمٰنَ مٰمُوْنًا ط..... (۲۴) "تم منصب و مقامِ ابراہیمی کے حصول کو اپنی نگاہ و تاز کی جلاں نگاہ بناؤ"۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو نوع انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے، جس کا مرکز کعبہ ہے، عالم گیر انسانیت کی لیڈر شپ حاصل کرو۔

اس اُمت نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر تھی۔ (۲۵)۔ اس مشاورت کی روزہ مرہ کی شکل تو صلوة کے اجتماعات تھے۔ آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور امامت صلوة کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے۔ (۲۶) نہیں پوری مملکت کے مسائل کے لئے مشاورت کے اجتماعات اس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالم گیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ اُمت کے اس عالم گیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا۔ اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کئے جاتے ضروری تھے انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماعِ عظیم

حج

کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ قَا دِیْنِیْ فِی النَّاسِ بِالْحَقِّ (۲۷) "تم اعلان کرو، تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لئے آئیں" اس اُسوہِ ابراہیمی کے اتباع میں اس اُمت پر بھی یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ وہ ان اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو اُمت کی باہمی مشاورت کے لئے ہوں گے، لیکن ان میں شرکت کے لئے تمام انسانوں (الناس) کو دعوت دی گئی ہے۔ یہ بحیثیت مبصر شریک ہوں گے۔ اس سے مقصد کیا ہے، اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتادینا کافی ہو گا کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا

کہ آجوت فی الناس بالحق..... (۲۲) حج کے لئے تمام لوگوں کو دعوت دو۔ اسی طرح امت مسلمہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مِنْ اسْتِطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا..... (۲۳) جو لوگ بھی (الناس) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، انہیں چاہیے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے (اللہ) حج کے اجتماع میں شرکت کریں۔ آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی الناس کہا ہے، اسے مؤمنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانہ قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ لیکن جس طرح، جب دینِ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند بالا پروگرام کے عملی اجزاء، بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماع نے بھی (کم و بیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی، اور حج ابراہیمی کے مناسک اور شعائر، مشرک اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے۔ بایں سہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے، تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا، اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور زد و کوب دینے کے بھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں، علاوہ دیگر امور، قبائل کے باہمی جھگڑے بٹائے جاتے تھے اور زیادتی کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روگنا عوار کے فریجے نہیں ہوتا تھا، دلائل و براہین کی روش سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حجت ہے جس کے معنی دلیل کے ہیں۔ اس جہت سے قرآنی دلائل کو الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ..... (۲۴) کہا گیا ہے۔ اہل لفظ کے ان بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا، اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

قرآن کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ اسے دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتح مکہ سے پہلے (۳ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا اس لئے وہاں قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتح مکہ کے بعد، شہد کا حج تو کم و بیش سال بھر روش پر ادا ہوا۔ لیکن شہد میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اس میں حضور خود تو تشریف نہیں لے گئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کو نمائندہ مملکت قرآنہ

حج اسلام

طے ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مکان حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے (کسی زمانے میں) تعمیر ہوا تھا لیکن بعد میں یہ، مرور زمانہ سے کھنڈر بن گیا اور اس کی صرف بنیادوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے دیواریں کھڑی کی تھیں۔ (۲۵)۔

کی حیثیت سے، قافلہ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم و بیش تمام سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا، لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزشوں سے پاک اور صاف کر کے اس سے پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلان عظیم تھا جو دینہ کی اسلامی مملکت کی طرف سے، غیر مسلموں (مخصوصاً قریش) کے ساتھ تعلقات کا مندر تھا اور جو سورۃ توبہ مذکور ہے۔ سلسلہ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتؐ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضورؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے صحیحہ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نقطہ داسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ رنگ و نسل و خون و زبان و وطن۔ قومیت۔ ذاتِ پات۔ برادری۔ قبائل، ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر، خالص ایمان کی بنیادوں پر، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع، انہی مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع و عریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان مشرک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ ان لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی۔ جنہیں ارکانِ اعمالِ حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دور دراز علاقوں سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس لئے میدانِ عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی جہت سے اسے عرفات کہتے تھے۔ (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہ مملکت یا اس کا نمائندہ، اپنے خطاب میں اس پر گواہی کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد، یہ نمائندگان مملکت، ہتھیار کے میدان میں جمع ہوتے۔ وہاں ادرتین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرتے۔ پھر مملکت کی پیچیدہ گھنٹیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغنیین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل و حجج کی روش سے کیا جاتا، دھاندلی اور سسینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر، یہ نمائندگان، اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مکہ، اس وادی میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (۱۲) اس علاقہ میں اگر لاکھوں انسانوں کا اجتماع ہوتا تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہو گا کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہو گا؟ قرآن کریم اس قسم کے اہم سوال کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ اس اجتماع میں شرکت کرنے والے اپنی "خود پاک" اپنے ساتھ آپ لائیں۔ ظاہر ہے کہ گوشت سے بہتر خوراک کو کسی بہتر کشتی تھی؟ اس نے کہا کہ یہ آئے والے کچھ خالص گوشت اپنے ساتھ لائیں۔ آئے وقت ان پر بے شک سائناتِ تجارت و غیرہ لادیں، اور یہاں پہنچ کر انہیں ذبح کر دیں۔ ان کا گوشت خود بھی کھا لیں، اور مکہ کے آبی مزیاع کو بھی کھلائیں جنہیں عام حالات میں گوشت نصیب نہیں ہوتا۔ سورۃ حج کی آیات (۲۲/۲۳) میں یہ تمام تفصیل درج ہے۔ ان کے لئے قربانی کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ (نہ ہی ان جانوروں کے متعلق جنہیں بقر عید پر قربانی کہہ کر ذبح لیا جاتا ہے)۔

لیکن اس کے لئے ایک شرط ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو ان مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۲/۲۵)۔ اسی بنا پر مشرکین مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ (۹/۹۸)۔

بہر حال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوع انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

(۱۰)

ہمارا حج

یہ تھا اجتماع حج کا مقصد۔ اُس زمانے میں دین اپنی اصلی شکل میں موجود تھا، لیکن جب وہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کے مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دین کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعار اور مناسک کو عملی حالہ برقرار رکھتا ہے، اور ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکام خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدہ مندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو ان کے اپنے ہی دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کئے جاتے ہیں، یہ دیکھتے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مقاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لئے اس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا۔ بات یہاں سے چلی گئی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ، نسل، زبان، خون، وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوع انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے) اُسے پھر سے ایک عالم گیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لئے ایک نظام تجویز ہوا تھا جس کا مرکز کعبہ تھا، اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے، اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ، بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں۔ چالیس ہزار ہجرت کا انبوہ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لئے وقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس، پچاس ہزار حاجیوں کے لئے (منہجیت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) ذریعہ مبادلہ جس قدر صرف ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی، شدت کی گرمی اور دیگر نامساعد حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں ان میں مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت، توانائی، روپیہ کے اس صرف اور اس قدر جانکاح مشقتوں کا حاصل کیا ہوتا ہے؟ ان افراد کا جذباتی اطمینان کہ ہم نے ایک فریضہ ادا کر لیا ہے۔ محض افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت

نہیں جس کی بنیاد اسلام کو ایک منفرد نظام حیات قرار دیا جاسکے! اس قسم کا اطمینان تو تمام اہل مذاہب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے اور کر لیتے ہیں!

علاوہ انہی دنیا کے تمام مسلمان اسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح غیر مسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افراد حج کے اجتماع میں بھی اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سال ادھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حرم کعبہ میں بھی، امام کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت یہاں اس اجتماع کی جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوع انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ وہی جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کا راج تو ایک طرف، غاصبوں تک میں اجتماع مخالفین کے دلوں میں دھڑکن پیدا کر دیا کرتا تھا اس کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ خفا میں اسرائیل کی حکومت کی حیثیت حس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔ گزشتہ پچیس تیس سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفا کے میدان میں دور و کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا طبرِ اخلاق ہو، اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم ہو رہا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے مذہب کے حج کا نتیجہ۔ الدین کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلانِ یرونیہ کی ٹبری غلط کوشش قوم کی پانے لگ جاتی۔ اب یہ امت غیر مسلموں کی چھوٹی سی چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی "مغضوب علیہ" قوم ہیں اس لئے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ مگر وہ انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

امت کی یہ حالت ہے کہ اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیتے جاتے ہیں کہ غاند، روفہ، حج، زکوٰۃ اور ان اسلام کی رسمی طور پر پابندی کرتے رہیں اور ان کی غرض و غایت اور مقصد و مطلوب کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف ملکیتیں بھی اپنا اپنا مفاد مضمر دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوا اس کے فروغ کا سامان ہم بیچنا کر انہیں تاکہ بکرتی ہیں کہ وہ مست رکھوں اور فکرِ صبح گاہی میں اسے بختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیش نظر، ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا:۔

یہ ہماری سعی پیہم کی کرامت ہے کہ آج
سبے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
صوفی و ملاک ملکیت کے بندے ہیں تمام
کنہ ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام!

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ - ارغمانِ بھانہ)

ابلیس کا یہ سحر اس وقت ٹوٹنے کا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنا لگی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ انتخاب کارفرما ہو کہ رہے گا کہ قَاتِلُ نَفْسِهِمْ قَاتِلُ قَوْمِهِمْ كَمَا قَاتَلَ نَفْسَهُ لَآ يَكُونُ ذَا آمْنًا نَكْرًا (۲۴)۔

اگر یہ (قرآن سے اسی طرح) روگردان رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لگی، اور وہ ان جیسی نہیں ہوگی۔

خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی امل نہوتی ہیں! لیکن اس استبدالِ قومی میں تباہی آتی ہے، وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام

پرویز